جناب مظفر حسین غزالی

علاّمہ حمید الدّین فراہیؒ کے تعلیمی افکار

علامہ فراہی چودھویں صدی ہجری کی ان عظیم شخصیات میں سے ایک تھے جن سے عالم اسلام اور مسلمان نہ صرف متاثر ہوئے ہیں بلکہ ان کے نظریات پر اسکول SCHOOL OF THOUGHT قائم ہوئے ہیں۔ آپ کا نام آتے ہی ذہن قرآنی افکار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن مولانا کے بہت سے افکار ایسے ہیں جن کی طرف ایک عام ذہن تو کیا غور و فکر کرنے والا ذہن بھی مشکل سے منتقل ہوتا ہے۔ ان کا نظریہ تعلیم بھی ان کے فکر عالی ہی کا ایک حصہ ہے۔ لگ بھگ اکتیس سالوں پر محیط زندگی (مدرسۃ الاسلام کراچی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، الٰہ آباد یونیورسٹی کی پروفیسری اور دار العلوم حیدر آباد (جامعہ عثمانیہ) کی پرنسپلی) کے سفر کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی افکار کی طرح مولانا کے تعلیمی افکار بھی بہت وسیع ہیں۔

مولانا کا یہ سفر ایسے دَور میں شروع ہوا جب کہ سرسید کی تعلیمی تحریک کا غلغلہ بلند ہو چکا تھا اور ملت کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے اور حالت کو بدلنے کے لیے بہت سے تعلیمی ادارے قائم کیے جا رہے تھے یا ہو چکے تھے۔ جن میں ندوۃ العلماء، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ عثمانیہ اہم ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی بساط اُلٹ چکی تھی، اور ملت زبوں حالی کی شکار تھی۔ اُس وقت مسلمانوں کے لیے تعلیمی نظام کے ساتھ ان کے وجود کی بقا بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے تعلیمی نظام کو نہ صرف ختم کر دیا تھا بلکہ ہر اُس چیز کو مٹانے کے درپے تھے جس سے مسلمانوں کے بیدار ہونے کی توقع تھی۔ ایسے وقت میں علامہ فراہیؒ نے تعلیم کا ایک نیا نظام پیش کرنے کی کوشش کی۔

ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے حتی المقدور علامہ فراہی کے تعلیمی افکار جمع کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اہل علم و دانش، علماء اور محققین کو اس طرف متوجہ کر سکوں۔ مولانا کے

تعلیمی افکار کا جائزہ لینے کے لیے آپ کے وسیع لٹریچر کی ورق گردانی کرنے کے ساتھ ساتھ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ مدرسہ مولانا کے تعلیمی نظریات کا آئینہ دار ہے۔ مولانا نے حیدر آباد سے واپسی کے بعد وفات تک اپنے اوقات کا بڑا حصہ مدرسہ پر صرف کیا۔ مولانا "ہر ہفتہ تین دن مدرسہ میں قیام کرتے، اساتذہ اور طلبہ کو قرآن مجید کا درس دیتے، منتظمین کو اپنے تعلیمی اور اصلاحی نظریات سے آگاہ کرتے۔ (آخر زمانہ میں) چند آدمیوں کو منتخب کر کے انھوں نے ان کی خاص طور پر تربیت فرمائی تاکہ وہ ان کے طریق فکر و نظر کو اچھی طرح اپنا لیں اور ان کے بعد اس تعلیمی اور فکری اصلاح کے کام کو جاری رکھ سکیں جو مولانا نے شروع کیا تھا"[۱]

علامہ فراہی اپنے تعلیمی نظریات کو محدود رکھنے کے بجائے انھیں وسیع حلقہ تک پھیلانے کے خواہاں تھے۔ وہ اس کے لیے پوری زندگی سرگرداں رہے۔ اس کا اندازہ اس تخیل سے کیا جا سکتا ہے جو حیدر آباد میں قیام کے دوران ان کے پیش نظر تھا:

"مولانا کے سامنے ایک ایسی یونیورسٹی کا تخیل آیا جس میں تمام دینی اور عصری علوم کی تعلیم اردو میں دی جائے۔ اگرچہ اس زمانہ میں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے وہ تمام امکانات مفقود تھے جو آج موجود ہیں۔ لیکن مولانا نے اپنے ٹھوس دلائل سے ریاست کے تعلیمی کارفرماؤں کو اپنے نظریہ کا قائل بنا لیا اور اس کی ایک ایسی اسکیم تیار کر کے لوگوں کے سامنے پیش کر دی جس کے بعد کسی کو بھی ان کے نظریہ سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی مولانا کا یہی تخیل بالآخر جامعہ عثمانیہ کی شکل میں عملی صورت میں ظاہر ہوا۔"[۲]

اردو یونیورسٹی کے قیام کی اسکیم اور نکات جو مولانا نے ریاست کے کارفرماؤں کے سامنے پیش کیے تھے ان کی تفصیل نہیں ملتی اور نہ ہی اس کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ حقیقتاً ان کی دی ہوئی اسکیم کے تحت ہی وجود میں آئی البتہ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اپنا منفرد تعلیمی نظریہ تھا اور کے تحت وہ ایک تعلیمی نظام ترتیب دینا چاہتے تھے۔ جس سے عملی اصلاح سے پہلے فکری اصلاح ہو سکے۔ کیونکہ عمل فکر کا نتیجہ ہوتا ہے، اور فکر کی اصلاح کے ذریعہ عمل کی اصلاح کا کام بہت

آسان ہوتا ہے۔ بقول امین احسن اصلاحی صاحب:

"اس فکری اصلاح کی بنیاد انھوں نے (علامہ فراہی نے) قرآن پر رکھی تھی۔ وہ قرآن کی روشنی میں مسلمانوں کے تمام علوم و افکار کا جائزہ لے کر ایک طرف تو یہ چاہتے تھے کہ فکر و نظر کے مختلف گوشوں میں جو باطل تصورات و نظریات گھس چکے ہیں ان کو بے دخل کریں اور دوسری طرف ان کی کوشش یہ تھی کہ زندگی کے تمام مسائل پر غور کرنے کے لیے قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کی راہیں کھول دیں۔"[۳]

مقصد تعلیم

علامہ فراہیؒ نے تعلیم کا مقصد متعین کرنے کے لیے قرآن (سورۃ التوبہ، آیت ۱۲۲) سے استدلال کیا ہے اور مقصد تعلیم ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے:

"تعلیم حاصل کرنے کے لیے تفقہ فی الدین کا لفظ (اس آیت میں) استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں دین میں فہم و بصیرت حاصل کرنا۔ اور تعلیم دینے کے لیے اِنذار کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ڈرانے، ہوشیار کرنے اور خاص طور پر آخرت کی زندگی کی تیاریوں کے لیے بیدار کرنے کے ہیں۔ یہ دونوں لفظ اسلام میں تعلیم کا جو اصل مقصد ہے اس کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔ اسلام میں تعلیم و تعلّم کا اصل مقصد دین میں بصیرت حاصل کرنا اور آخرت کی فلاح کے لیے اپنی اور دوسروں کی تربیت کرنا ہے۔ باقی چیزیں سب ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور اسی نصب العین کے تابع ہیں۔"[۴]

ان مختصر الفاظ میں تعلیمی نظام کے نقائص کی طرف بھی اشارہ ہے اور اسلامی ریاست کی تعلیمی پالیسی کی طرف بھی۔ یہ دونوں باتیں اس سے واضح ہو جاتی ہیں۔ اسلامی تعلیمی نظام کی یہی کلید ہے اور یہی اس کا مقصد بھی۔ علامہ فراہیؒ تفسیر نظام القرآن کے مقدمہ میں تعلیم کے انتہائی بنیادی دو اصولوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کسی تعلیم و دعوت کی ابتدا میں اس کے لیے لوگوں کے دل اچھی طرح نہیں

کھلتے جس کے سبب سے نہ تو تفصیلات کلام کے لیے ان کے اندر گنجائش ہوتی ہے نہ جزئیات احکام کے لیے۔ اس وجہ سے ابتدا میں لوگوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ جوامع الکلم یعنی چھوٹے چھوٹے پُرحکمت فقروں اور جملوں میں دی جاتی ہے۔ یہ جوامع الکلم کے بیج جب پھوٹتے ہیں تو تفصیلات سے ان کی آبیاری کی جاتی ہے، اور اس طرح آہستہ آہستہ دل کی وسعت اور اس کے علم دونوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔"[۵]

اس کے اندر مولانا نے تعلیم کے جو اصول بیان کیے ہیں، ان میں اوّل آموزش کا اصول ہے یعنی انسان کے اندر نطق و گویائی کی صلاحیت دھیرے دھیرے پیدا ہوتی ہے۔ دوم اس نطق و گویائی اور علم کو وسعت دینے کے لیے ایک خاص تکنیک ہے جس سے مواد تیار کیا جاتا ہے۔ اس مواد کی تیاری میں اس بات کا بہت خیال رکھا جاتا ہے کہ جملوں کی ساخت اور ان میں استعمال ہونے والے الفاظ کس عمر کے طلبہ کے لیے کس طرح کے ہوں گے۔ طلبہ کے ذہن کے لحاظ سے ہی ان جملوں اور الفاظ میں مفاہیم پیش کیے جاتے ہیں، بتدریج اُس کو اس منزل تک لایا جاتا ہے کہ مشکل سے مشکل چیزوں تک ان کی رسائی ہو سکے۔ مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ فراہیؒ تعلیمی اصولوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور تعلیمی نفسیات سے بھی۔ مولانا کی درسیات اس پر دلیل ہیں۔

سورۂ الرحمٰن کی آیات "اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" (۱/۳)، کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"ان آیات کا آغاز اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے کیا، کیوں کہ وہی رحمت اور تعلیم کا مبدا ہے اور تمھیں بتلایا کہ اس کی بے پایاں رحمت یہ ہے کہ اس نے قرآن کی تعلیم دی۔ اس نے تمھیں پیدا کیا اور بولنا سکھایا تاکہ تم اپنے آپ کو اس تعلیم کے لیے تیار کر سکو۔"[۶]

سورۂ التوبہ کی ۱۲۲ ویں آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر سب ہی لوگ اپنی اپنی جگہوں سے اُٹھ کر مجلس نبویؐ میں نہیں پہنچ سکتے تھے تو ایسا کیوں نہیں کیا گیا کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت علم دین میں فہم و بصیرت

حاصل کرنے کے لیے مجلس نبویؐ میں حاضر ہوتی تاکہ وہاں سے مستفید ہو کر اپنی قوم کو بھی اس سے مستفید کرتی۔ مطلب یہ ہے کہ ہر بستی سے لوگ باری باری مدینہ آئیں، دین سیکھیں اور سمجھیں اور پھر اپنی قوم میں واپس جا کر لوگوں کو بتائیں اور سکھائیں۔ اس طرح دیہات کے لوگ اپنے گھر، در اور مال مویشی کی دیکھ بھال بھی کر سکیں گے اور نبیؐ اور صحابہؓ کے فیوض صحبت سے بھی مستفید ہو سکیں گے۔"

اگر اقلیتوں کی ترقی کی تاریخ کو اس تشریح کی روشنی میں دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے سامنے تعلیم اور معاش دو اہم مسئلہ ہوتے ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے سماج کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ ایک وہ لوگ ہوں گے جو معاشی اعتبار سے قوم کو دوام و استحکام بخشیں، اور دوسرے وہ جو تعلیم حاصل کریں اور اسے عام کریں۔ تعلیم حاصل کرنے والے گروہ کی کفالت پہلا گروہ کرے اور دوسرے گروہ کی ذمہ داری ہو کہ وہ پہلے گروہ کے لوگوں کو خواندہ کرے۔ اس طرح پوری قوم میں سمجھ بھی پیدا ہوگی اور معاشی اعتبار سے مضبوطی بھی۔

صلاح و فلاح کا مدار

علامہ فراہیؒ نے مدرسۃ الاصلاح کے دستور میں مسلمانوں کی صلاح و فلاح کا مدار دینی تعلیم بتایا ہے۔ پھر سوال کرتے ہیں لیکن دینی تعلیم کیا چیز ہے؟ کیا وہی جس پر ہم صدیوں سے اپنی صلاحیت اور دولت برباد کر رہے ہیں؟ یقیناً وہ نہیں ہے۔ اگر وہی چیز ہوتی تو اس تعلیم کا ہماری زندگی پر وہی اثر ظاہر ہوتا جو صدر اول میں ظاہر ہوا تھا۔ ایسا نہ ہوتا کہ مسلمان اس تعلیم کے باوجود برابر گرتے جاتے یہاں تک کہ ذلّت و نکبت کی آخری سرحد تک پہنچ کر دنیا کے لیے صرف سرمایۂ عبرت بن کر رہ جاتے۔

پھر اپنے کرب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ صدر اول کے مبارک دَور کے بعد مسلمانوں نے اپنی سب سے زیادہ عزیز متاع جو کھوئی ہے وہ صحیح مذہبی تعلیم ہے۔ اگر ہم اس تعلیم پر قائم رہتے تو ہمارے جیب و دامن ان ثمرات و برکات سے خالی

نہ ہوتے جس سے دورِ اول کا گوشہ گوشہ معمور تھا۔"

اس کیفیت سے نکلنے کا تاریخ کی روشنی میں حل بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جب سطحِ ارضی ایک ہمہ گیر تاریکی میں روپوش تھی تو خدا نے قرآن ہی کے ذریعہ اس میں اُجالا کیا، اور آج بھی جب کہ اسلام پھر غربتِ اولیٰ میں مبتلا ہو گیا ہے اور خدا کے بندوں پر خدا کی کھولی ہوئی راہ گم ہو گئی ہے تو قرآن ہی کی روشنی اس بند دروازے کو کھول سکتی ہے۔

پس دینی تعلیم کی اصل راہِ عمل یہ ہے کہ قرآن کو اس کا اصلی مقام دیا جائے اور وہ یہ ہے کہ قرآن ہمارے تمام علم و عمل کا سرچشمہ ہو۔ سب سے پہلے ہم وہ جانیں جس کی ہمیں وہ تعلیم دیتا ہے اور ہم وہ کریں جس کا وہ ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ علم و عمل کی ہر شکل میں سب سے پہلے ہم اس کا دروازہ کھٹکھٹائیں وہ ہماری رہبری کرے گا۔ اگر اس کا کوئی اشارہ ہم پر مخفی رہ جائے تو ہم اس ذاتِ گرامیؐ کے اقوال و اعمال کی طرف رجوع کریں، جس کی پاک اور مقدس سیرت، اس کی عملی شرح و تفسیر ہے، اگر یہاں بھی کوئی ابہام رہ جائے تو اس سیرتِ پاک کے مقدس حاملین یعنی صحابہ کرام، تابعین عظام، ائمہ انام کے اقوال و اعمال میں اپنے دل کی تشفی ڈھونڈھیں کیوں کہ انھوں نے جو کچھ کہا اور کیا اسی نورِ الٰہی اور نورِ نبوت سے ماخوذ ہے۔"[۴۸]

مدارسِ دینیہ کے نصاب پر تنقید

علامہ فراہیؒ نے مدارس کے نصاب اور نظامِ تعلیم پر سخت تنقید کی ہے۔ وہ قرآن مجید کی محققانہ تعلیم کو مدارس کا بنیادی نصب العین قرار دیتے ہیں۔ مولانا نے مدارس کا بہت گہرائی سے جائزہ لے کر ایک تحقیقی تجزیہ پیش کیا ہے، رقم طراز ہیں:

"اس اصل عظیم (قرآن) کو پیشِ نظر رکھ کر آپ تمام دینی مدارس پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ کتابِ الٰہی ہر جگہ متروک اور مہجور ہے۔ نصاب ان

کی جدولیں منطق و فلسفہ اور علم کلام کی کتابوں سے اٹی ہوئی ہیں مگر سرچشمۂ علم یعنی قرآن کا کہیں پتہ نہیں۔ اگر کچھ اعتنا ہے تو صرف اس قدر کہ جلالین اور بیضاوی کے چند پارے تبدیلِ ذائقہ کے لیے پڑھا دیے جاتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں کی ذہنی حالت بالکل برباد ہو گئی۔ وحیِ الٰہی کا سررشتہ ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور یہود کی طرح مسلمان بھی خدا کی کتاب کی جگہ یونانیات اور اسرائیلیات کے ٹونوں اور ٹوٹکوں میں پھنس گئے۔ کتابِ الٰہی مہیمن اور حکم تھی جس کی کسوٹی پر ہم کھرے کھوٹے کی تمیز کر سکتے تھے۔ اس سے لاپروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمیز اور معرفت برباد ہو گئی۔ اور پھر یہ ہوا کہ جس کے ہاتھ جو کتاب لگی وہ صحیفۂ آسمانی بن گئی، الگ الگ فرقے قائم ہو گئے۔"[۴۸]

علامہ فراہیؒ مدارس اور تعلیم کی سطحی اصلاح کے مشنوں سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ اس طرح کی کوششوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"ملت کی زبوں حالی نے روشن خیال اور بیدار مغز علما میں یہ تحریک پیدا کی کہ تعلیم کی اصلاح کی جائے اور دینی مدارس کے اندر ایسا نصاب تعلیم جاری کیا جائے جو مقتضیات زمانہ کے مطابق ہو تاکہ ضروریات زمانہ کے مطابق روشن خیال اور بیدار مغز علما پیدا ہو سکیں۔ اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہندوستان میں بعض درسگاہیں قائم ہوئیں جن کے نصاب تعلیم میں بعض ایسے علوم و فنون کا اضافہ کیا گیا جس کو مذاق حال عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ کوشش نیک اور مبارک تھی لیکن مسلمانوں کی حالت میں اس سے کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی، مسلمانوں کو مقتضیات زمانہ کے مطابق نہیں بننا ہے بلکہ زمانہ کو خدا اور خدا کے رسول کی پسند کے مطابق بنانا ہے۔"[۴۹]

تعلیم کا ایک جامع خاکہ

مولانا نے مدارس کے تعلیمی نصاب اور نظام کی اصلاح کے لیے ایک جامع تعلیمی خاکہ بھی

مرتب کیا ہے۔ اس خاکہ میں ان تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو اصلاح کے لیے ضروری ہیں اور جن سے ملّت کی زبوں حالی دور کی جاسکتی ہے۔ اس خاکہ میں وسعت بھی ہے اور جدّت بھی۔ علوم وفنون کے بے جا وزن کو بھی کم کیا گیا ہے اور بلند معیار کو حاصل کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ کم وقت، کم خرچ کے ساتھ مفید اور موجودہ زمانہ کی ضروریات کے تحت کارآمد تعلیم کا ایک واضح نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

"قرآن مجید کی محققانہ تعلیم مدرسہ کا بنیادی نصب العین ہو، اس کے بعد حدیث اور فقہ پر زور دیا جائے۔ منطق، فلسفہ، علم کلام کی غیر ضروری کتابیں نصاب سے نکال دی جائیں اور ان کی جگہ ادب عربی کی تعلیم دی جائے، حدیث کی تعلیم جماعتی عصبیت سے آزاد ہو، فقہ میں فقہ اسلامی پڑھائی جائے تاکہ طلبہ میں وسعت نظر اور رواداری پیدا ہو، تکفیر وتفسیق اور فضول مذہبی مناقشات کا کوئی ولولہ ان کے اندر نہ ابھرے، صرف ونحو کی تعلیم عملی ہو، فنون کی تعلیم میں امہات فن پیش نظر رہیں، درس دینے میں لیکچر کا طریقہ اختیار جائے، بقدر ضرورت انگریزی بھی پڑھائی جائے، حصول معاش کے لیے اگر حالات سازگار ہوں تو مفید صنعتیں بھی ضرور سکھائی جائیں۔ مدت تعلیم کم سے کم ہو اور نرخ تعلیم انتہائی حد تک ارزاں۔" [۱۰]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے اسباق النحو حصہ اول ودوم اور دوسری درسیات اسی خاکے کی روشنی میں تیار کی تھیں۔ اسباق النحو کے دونوں رسالوں کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اس کے ذریعہ طلبہ کی اس دشواری کو بڑی حد تک دور کرنے کی کوشش کی ہے جو انھیں عوامل کی بحثوں میں ہوتی تھی۔ ان کے مطالعہ سے طلبہ میں عربی پڑھنے کے لیے شوق پیدا ہوتا ہے اور زبان کا استعمال آسان محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ رسالے ابتدائی نحو وصرف کی تعلیم کے لیے بہت مفید ہیں۔

مدرسۃ الاصلاح مولانا کی علمی کاوشوں کا ایک نتیجہ ہے۔ اس کے نصاب پر گفتگو موقع کی مناسبت سے کچھ ضروری محسوس ہوتی ہے۔ گفتگو کو طویل کرنے کے بجائے اس وقت ان الفاظ پر اکتفا کروں گا جو علامہ فراہیؒ نے اس نصاب کے بارے میں فرمائے ہیں:

"وہ (مدرسۃ الاصلاح کا نصاب) تمام علوم دینیہ اور بقدر ضرورت علوم دنیویہ

کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اس طرح کہ شاخیں اصل کی جگہ نہ لے لیں۔ اس کے نصاب تعلیم میں قرآن مجید ایک آفتاب ہے جس سے تمام تارے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ حدیث، فقہ، اصول فقہ، منطق، فلسفہ، علم کلام، تاریخ وسیر، فلسفہ، تاریخ، اسرار شریعت، ادب وبلاغت، نحو وصرف جملہ فنون پڑھائے جاتے ہیں۔ کچھ اس لیے کہ فہم کتاب الٰہی کے لیے وسیلہ وذریعہ ہیں اور کچھ اس لیے کہ اس کی شرح وتفسیر ہیں۔ لیکن یہ سب اس انداز سے پڑھائے جاتے ہیں کہ جس فن کی طرف قدم بڑھے قرآن کی روشنی میں، اور جس علم کا دروازہ کھلے قرآن کے اندر سے۔" [۱۱]

اس تجزیہ سے علامہ فراہیؒ کے جو تعلیمی افکار اُبھر کر سامنے آتے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں کہ جہاں وہ تعلیم لاحاصل ہے جس سے بصیرت ومعرفت حاصل نہ ہو وہیں اس تعلیم کی بھی کوئی وقعت نہیں جس میں قرآن سے رہنمائی حاصل نہ کی گئی ہو۔ جو تعلیم ذہن کو شیطان کی مقصد برآری میں صرف کرے وہ بربادی کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔ اس سے خیر کی امید لاحاصل ہے۔ جو تعلیم اپنے محور (یعنی قرآن) سے ہٹی ہوئی ہے وہ صحیح مذہبی تعلیم نہیں۔ اور مذہبی تعلیم کے بغیر انسان کو معرفت اور بصیرت کا نور نہیں مل سکتا، وہ ظلمت کی تاریکیوں میں بھٹکتا رہے گا جب تک کہ اسے حکمت ومعرفت نصیب نہ ہو جائے۔

علامہ فراہیؒ ہر مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں دیکھنے اور حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں چاہے وہ ملّت کی ذلّت ورسوائی کا مسئلہ ہو یا اس کی سربلندی کا، حکومت کا مسئلہ ہو یا سماج کا، معاش کا مسئلہ ہو یا تعلیم کا، الغرض وہ ایک ہی وسیلہ سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور وہ وسیلہ ہے قرآن۔ اسی کی بنیاد پر ان کی فکر بنی ہے۔ ایسی صورت میں ان کے سیاسی افکار ہوں یا سماجی، معاشی افکار ہوں یا تعلیمی، انھیں مرتب کرنے، جائزہ لینے یا مستفید ہونے کے لیے قرآن کے افکار سے واقف ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ مولانا کے افکار قرآن سے ماخوذ اور مستنبط ہیں۔ چنانچہ قرآن کے تصور علم سے واقف ہوئے بغیر مولانا کے تعلیمی افکار کو سمجھنا دشوار ہے۔ قرآن اور مولانا فراہیؒ کے تعلیمی افکار پر الگ سے کام ہونا چاہیے۔

تعلیقات وحواشی

۱۔ دیباچہ تفسیر نظام القرآن، ص ۱۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۳

۳۔ ایضاً، ص ۲۰

۴۔ تدبر قرآن جلد سوم، ص ۲۵۱

۵۔ مقدمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۵۵

۶۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۰ء، ص ۴۳

۷۔ مدرسۃ الاصلاح کا دستور، مطبوعہ ۱۹۸۵ء، کوثر پریس، سرائے میر اعظم گڑھ، ص ۱۷

۸۔ ایضاً، ص ۱۳

۹۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۹

۱۲۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ۔ ایک عظیم مفسر، مؤلف محمد عنایت اللہ سبحانی اصلاحی، مکتبۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ، اشاعت اوّل، نومبر ۱۹۷۶ء۔